تذکارِ اصغر

شاہ محمد سراج الحق مچھلی شہری

اللہ بخشے استاد محترم حضرت اصغر گونڈوی مرحوم کو! کیا خوب آدمی تھے! ۔ دنیا نے انھیں شاعر سمجھا اور اتفاق یہ کہ وہ دنیا کے سامنے شعر و سخن ہی کے ذریعہ روشناس بھی ہوئے مگر میں نے تو انھیں ایک اچھے شاعر سے کہیں زیادہ ایک اچھا دوست اور ایک اچھا انسان پایا کہ ؏

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا!

لیکن اگر دنیا کو انھیں شاعر ہی سمجھنے پر اصرار ہے تو پھر ضروری ہے کہ لفظ شاعر کو شعر سے نہیں "شعور" سے مشتق کہئے اور شعور کو بھی اس کے زیادہ سے زیادہ وسیع معنوں میں لیجئے تب کہیں جاکر یہ لقب (شاعر ان کے پیکرِ عالی کے لائق) اور یہ ملبوس ان کی قامتِ بلند کے لئے موزوں ہو سکتا ہے۔ کیونکہ میرے نزدیک ان کا چلنا پھرنا۔ ہنسنا بولنا۔ کھانا پینا۔ ان کی معاملت۔ اُن کی معاشرت، ان کی دوستی دُشمنی غرض ان کے صحیفۂ حیات کا ہر ورق بلکہ ہر سطر اور ان کے چہرۂ زندگی کا ایک ایک خط و خال ایک اعلیٰ اور پاکیزہ شعور کا عمدہ نمونہ تھا۔

حضرت اصغر کو گوشہ نشینی، خاموشی اور خلوت وغیرہ سے طبعاً مناسبت نہ تھی۔ وہ جلوت کے آدمی تھے۔ احباب کے ساتھ بیٹھ کر ان کا دل شگفتہ ہوتا تھا۔ وہ خود ظریف طبع اور لطیف مزاج واقع ہوئے تھے اور جب اسی وصف کا کوئی آدمی انھیں مل جاتا تھا تو اس سے بہت خوش رہتے تھے۔ الہ آبادی احباب میں دو حضرات ایسے تھے۔ ایک شاہ عبدالمعبود صاحب سجادہ نشین دائرہ حضرت ملا سید محمدی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے شاہ محمد حسین صاحب ساکن دائرہ شاہ عبدالعلیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔

تنگ نظر لوگ شاید اسے رئیسانہ سی محفل آرائی اور عیش پرستی سمجھتے ہوں۔ مگر اصغر صاحب میں یہ چیز فطری تھی۔ ان کی اس عادت کا ڈانڈا ان کی فطری جمالیاتی افتاد۔ اُن کی فطری لطافت پسندی اور ان کی فطری نشاط دوستی سے ملتا ہے۔ وہ زندگی کو رو کر نہیں ہنس کر گزارنے کے عادی تھے۔ وہ مصائب میں بھی مسکراتے تھے۔ ان کا کلام اس کا شاہد ہے:-

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں، زندگی دشوار ہو جائے

غزل کیا! اک شرارِ معنوی گردش میں ہے اصغرؔ
یہاں افسوس گنجائش نہیں فریاد و ماتم کی

اصغرؔ نشاطِ روح کا اک کھل گیا چمن
جنبش ہوئی جو خامۂ رنگیں نگار کو

خود مجھے جب کبھی غمگین اور رنجیدہ دیکھتے، غم غلط کرنے کی سعی کے ساتھ برابر اس کی بھی ہدایت کرتے کہ گذشتہ زندگی کی راحتیں اور نعمتیں یاد کر کے غم بھلانے کی کوشش کیجئے۔ زندگی رونے بسورنے کے لئے نہیں ملی ہے۔ روئے تو وہ جس کا خدا رحم سے عاری ہو۔ ہمارا تو خدا — خود ارحم الراحمین ہے۔ اس لئے ہمیں مستقبل میں بھی اُس سے رحم و کرم ہی کی امید رکھنی چاہئے پھر رنج کیوں؟ اور غم کس لئے؟

اصغر صاحب غالباً ۱۹۲۷ء میں انڈین پریس الہ آباد میں اردو سیکشن کے نگراں بن کر آئے تھے۔ چند برسوں کے بعد حکومت کی طرف سے سرتیج بہادر سپرو کی نگرانی و سرپرستی میں الہ آباد میں ایک اکاڈیمی (دارالعلم) کھولی گئی۔ اصغر صاحب اس میں شعبۂ اردو کے نگراں مقرر ہوئے اور ان کی ادارت میں ایک سہ ماہی رسالہ "ہندستانی" نکلتا رہا۔ اصغر ایک صاحب کمال شخص تھے اور کمال کے لئے حاسدوں کا وجود بھی ناگزیر ہے۔ یہاں ان کے حاسدوں کی ایک مستقل جماعت تھی جو نفاق کی ماہر تھی۔ اس کے افراد جب اصغر سے ملتے تو یہ معلوم ہوتا کہ ان سے بڑھ کر کوئی اصغر کا ہمدرد اور دوست نہیں اور جب اپنے ہمجولیوں میں پہنچتے تو کہتے کہ "ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ وہ تو ہم اُن کا مذاق اُڑا رہے تھے"! تقرر سے قبل اکاڈمی میں اصغر صاحب کی بھی درخواست تھی اور انھیں مخالفین میں سے ایک اور صاحب کی بھی۔ ایک دن میں اور اصغر صاحب ساتھ ساتھ انڈین پریس سے کٹرہ کے مکان کو جا رہے تھے۔ میور سنٹرل کالج کے مینار کے پاس سڑک پر پہنچے تھے کہ اُدھر سے وہی صاحب آ رہے تھے۔ اصغر سے کہنے لگے "اصغر صاحب! کچھ معلوم ہوا اکاڈمی میں کس کے تقرر کا امکان زیادہ ہے؟" اصغر نے کہا "خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ مجھے تو کچھ خبر نہیں"! ان حضرت کو کہیں سے کچھ سُن گن مل چکی تھی کہ زیادہ امکان اصغر صاحب کے تقرر کا ہے تو انھوں نے طنزاً کہا "مجھے تو حالات سے اندازہ کچھ ایسا ہو رہا ہے کہ اس جگہ پر کسی "نالائق" ہی شخص کا تقرر ہو گا"! اصغر صاحب نے برجستہ کہا "تو پھر مجھے مایوس نہ ہونا چاہئے"! یہ جملہ اس قدر برجستہ اس درجہ برمحل اور اتنا موزوں تھا کہ وہ صاحب تو بس کٹ کر رہ گئے! کیونکہ اس میں ان کے مخفی طنز کو برافگندہ نقاب کر دیا گیا تھا!

اصغر صاحب جب الہ آباد آئے تو پہلے محلہ کٹرہ میں میناشاہ کی مسجد سے متصل اُتّر جانب پہلے مکان کے نیچے والے حصہ میں رہتے تھے اُس مکان میں پیش خانہ تو خیر کچھ تھا ہی نہیں سخت گرمیوں میں اگر کرسیاں باہر نکال کر بیٹھتے تو گویا سڑک کے کنارے بیٹھنا پڑتا تھا اس کے علاوہ مکان کے پڑوس ان کے مذاق کے نہ تھے بس ایک بزرگ علم و ہنر کے قدرداں تھے اور وہ تھے عم محترم مولانا سید مقبول احمد صاحب صمدنی (مرحوم) سررشتہ دار کمشنری۔ ان کا مکان میناشاہ کی مسجد سے متصل دکھن جانب تھا۔ پڑوسیوں کے ناجنس ہونے ہی کے باعث اصغر صاحب اکثر یونیورسٹی کے ان پروفیسروں کے یہاں نشست رکھتے جن کے مکانات قریب تھے، مثلاً ڈاکٹر زبید احمد صاحب صدر شعبۂ عربی و فارسی اور پروفیسر مصرا۔ لیکن انھیں خانگی ضرورتوں سے ہر روز ورنہ ہر دوسرے روز چوک آنا پڑتا تھا۔ اس دقت کی وجہ سے ان کے جی میں آیا کہ چوک سے قریب کہیں مکان لیں۔ چنانچہ انھوں نے جانسین گنج میں (شمس الدین صاحب وکیل کے مکان کے متصل) ایک مکان کرایہ پر لیا۔ یہ مکان دو منزلہ بلکہ سہ منزلہ تھا۔ اسی مکان میں مقیم تھے جب ان پر پہلی بار فالج کا حملہ ہوا۔ ان کے کلام کا دوسرا مجموعہ

"سرودِ زندگی" اسی مکان کے قیام کے زمانہ میں مرتب اور شائع ہوا تھا۔ یہ مکان آرام دہ اور ان کی ضروریات کے لئے کافی اور انھیں پسند بھی تھا۔ مگر پائیں خانہ اس میں بھی نہیں تھا۔ اس کے علاوہ چوک کے قریب اور شاہراہ کے قریب شہر میں کوئی صاحبِ شعور اس مشینی دور میں رہنا کبھی پسند نہیں کر سکتا۔ اصغر صاحب یار باش اور احباب دوست سب سہی لیکن چوبیس گھنٹے گراموفون کا بجتے رہنا۔ موٹروں کے ہارن کا غلغلہ مختلف جلوسوں کے ہنگامے۔ برات شادی کے باجوں کا شور۔ ان سب کی برداشت کوئی صحیح المذاق اور تندرست آدمی بھی نہیں کر سکتا نہ کہ اصغر جو صاحبِ شعور ہونے کے ساتھ اب بیمار بھی ہو گئے تھے اس لئے اس مکان سے گھبرانے لگے اور انھیں کسی پُرسکون مکان کی تلاش ہوئی۔ ایک دوست نے اطلاع دی کہ یونیورسٹی سینٹ ہال کے مقابل پورب جانب بلویڈیر پریس سے متصل ایک بنگلیا (کاٹج) خالی ہے۔ وہ جگہ بہت پرسکون ہے اس لئے کہ سڑک سے دور تک پہلے اس احاطہ کی سڑک چلی گئی ہے۔ اس کے بعد وہ کاٹج ہے اس لئے سڑک کا شور وہاں پہنچتے پہنچتے ختم اور گم ہو چکتا ہے۔ بنگلیا دیکھی گئی' صاف ستھری تھی۔ بجلی کی روشنی۔ نل۔ بیٹھک کا کمرہ اس کے سامنے وسیع پیش خانہ۔ آس پاس ہرے بھرے درخت۔ پھول کی کیاریاں تھیں۔ مکان نہایت پُرسکون، ماحول نہایت شعر آفریں' فوراً لے لیا۔ اسی گھر میں فالج کا تیسرا حملہ ان پر ہوا اور سخت ہوا اور ۳۰ نومبر ۱۹۳۶ء کو وہ رہگزائے عالمِ بقا ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اصغر صاحب بہت کثیر الاحباب۔ مہمان نواز۔ سیر چشم عالی ہمت انسان تھے۔ اس کے ساتھ وہ وسیع المشرب بھی تھے وہ غیر مسلم حضرات کے ساتھ بھی برابر نہایت کشادہ روئی۔ فراخدلی اور خلوص و محبت سے پیش آتے تھے۔ ان کے یہاں معیار صرف خوش مذاقی تھا۔ جو اس معیار پر پورا اُترتا تھا اس کے وہ مدت العمر دوست رہے۔ ان کے غیر مسلم دوست بھی ان کی فراخ حوصلگی کے قائل تھے۔

ان کے ایک غیر مسلم دوست کے یہاں میں اکثر ان کے ہمراہ گیا ہوں۔ گرمیوں کا زمانہ ہے۔ میں اور اصغر صاحب کھانا کھا کر اُن دوست کے یہاں پہنچ گئے ہیں۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی گفتگو ہوتی رہی۔ اس کے بعد نیند کا غلبہ ہوا۔ پنکھا چل رہا ہے۔ پروفیسر صاحب اُٹھ کر اندر چلے گئے۔ ہم دونوں وہیں فرش پر تکیوں پر سر رکھے سو گئے۔ دن ڈھلے کوئی دو ڈھائی بجے آنکھ کھلی۔ میں کہہ رہا ہوں "اصغر صاحب اب گھر چلیے۔ ظہر کی نماز پڑھنی ہے" کہنے لگے۔ "ٹھہریئے نماز یہیں آجائے گی"۔ میں سمجھا نہیں ان کی صورت دیکھنے لگا۔ اب وہ پروفیسر صاحب بھی اندر سے آ گئے تھے کہنے لگے "کیا نماز پڑھئے گا؟" ہم نے کہا ہاں۔ تو اُنھوں نے الماری کے اوپر سے ایک کپڑا اُتارا اور کھولتے ہوئے کہا لیجئے یہ جا نماز موجود ہے پڑھ لیجئے۔ دیکھا تو ایک چکتے چھاپے کی اچھی خاصی غالباً نئی جا نماز! ہم دونوں نے وہیں ظہر کی نماز پڑھی۔ تھوڑی دیر بعد اندر سے ناشتہ آیا۔ کھایا گیا۔ پھر نماز عصر بھی وہیں پڑھ کر جب ہوا اور فضا کی گرمی کچھ کم ہوئی تو اُٹھ کر اصغر صاحب کے گھر واپس آئے۔ راستہ میں میں نے پوچھا "کیا یہ جا نماز آپ نے لاکر یہاں رکھدی ہے کہ جب یہاں کسی نماز کا وقت آجائے تو آپ کو دقت نہ ہو۔" کہنے لگے نہیں بلکہ پروفیسر صاحب نے میری خاطر سے خود خرید کر رکھی ہے!

ایک مولوی صاحب ناقل تھے کہ ایک دن میں اصغر صاحب کے ساتھ چڑیوں کے شکار میں گیا۔ شکار کچھ ملا نہیں تو سہ پہر کے قریب ناکام واپس ہوئے۔ راستہ میں اصغر صاحب اپنے ایک

غیر مسلم پروفیسر دوست کے گھر پر رُکے۔ وہاں اتفاق سے
پروفیسر صاحب کے کچھ اور احباب بیٹھے تھے اور ایک
جانب انھیں میں ان کی ایک عزیزہ بھی بیٹھی تھیں اصغر صاحب
کو دیکھ کر پروفیسر صاحب نے بہت تپاک سے ان کو کمرہ میں
لیجاکر بٹھایا۔ مولوی صاحب کہتے تھے کہ میں بھی کمرہ میں چلا گیا
اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ بیٹھنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ اس
بزم میں ایک خاتون بھی شریک ہیں اب میرا بڑا حال
نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔ میں نے گھبرا کر اصغر صاحب
کی طرف دیکھا وہ پروفیسر صاحب سے باتوں میں مشغول
تھے۔ کچھ دیر اسی طرح گزری مگر اصغر صاحب باتوں میں
اُسی طرح مشغول تھے کہ ایک صاحب نے کہا۔ اصغر صاحب اگر
زحمت نہ ہو تو کچھ کلام سُنائیے۔ اصغر صاحب اپنا کلام کبھی
خود بہت کم سناتے تھے اور اگر اُن کے ہمراہ کوئی دوست خوش آواز
اور موزوں طبع ہوتا تب تو وہ اپنا کلام خود کبھی سناتے ہی نہیں
تھے بلکہ اُن دوست کی طرف اشارہ کرکے کہہ دیتے کہ اُن سے کہئے
انھیں اگر کوئی غزل یاد ہو تو یہی سُنائیں مجھے تو یاد نہیں۔ چنانچہ
اس وقت بھی اصغر صاحب نے میری (اُن مولوی صاحب کی)
طرف اشارہ کردیا کہ انھیں سے کہئے یہ کچھ غزلیں یاد کئے ہوئے
ہیں سنا دیں گے۔ لوگوں نے مجھ سے فرمائش کی تو تعمیل حکم میں
میں نے اصغر صاحب کی ایک تازہ غزل جو مجھے بہت پسند تھی سنائی۔

رقص مستی دیکھئے، وجد تمنا دیکھئے
سامنے لاکر انھیں اپنا تماشا دیکھئے

صدمکاں وصد زماں وایں جہاں آں جہاں
تم جو آجاتے تو ہم وحشت میں کیا کیا دیکھتے

مولوی صاحب کہتے تھے کہ میں یوں تو غزل سنا رہا تھا مگر میں
سخت پریشان تھا۔ اور میری پریشانی میری آواز کی ناہمواری سے
غالباً ظاہر ہو رہی تھی۔ میں ان خاتون کی موجودگی کے باعث بار بار
یا تو نظر نیچے جھکا لیتا اور یا بہ تکلف دوسری جانب منہ پھیرے رہتا
مگر وہ بھی نہ بن پڑتا اس لئے کہ کمرہ میں ہر طرف سے حاضرین داد
دے رہے تھے۔ اس لئے مجھے اتفاقاً کبھی ان کی طرف بھی رُخ کرنا
پڑتا ہی تھا بس ادھر منہ کرتے ہی جلدی سے منہ دوسری طرف
پھیر بھی لیتا تھا۔ اصغر صاحب میری یہ شکل دیکھ اور کچھ رہے تھے
جب وہاں سے ہم لوگ چلے تو اصغر صاحب نے کہا "مولوی صاحب
عورتوں کا بے پردہ محفل میں آنا مجھے بھی پسند نہیں۔ میں آپ کی
اس وقت کی پریشانی اور بے چینی دیکھ دیکھ کر دل میں بہت نادم ہو رہا
تھا میری وجہ سے آپ کو یہاں پھنس جانا پڑا معاف کیجئے کہ آج
سے کسی ایسی محفل میں آپ کا جانا میں کبھی پسند نہ کروں گا۔

ایک بار میرے وطن مچھلی شہر (ضلع جونپور) میں وہاں کے
ارباب ذوق نے ایک مشاعرہ بڑے پیمانہ پر کرنا چاہا۔ جون پور
الٰہ آباد۔ بنارس سے شعراء کو مدعو کیا۔ الٰہ آباد سے اصغر صاحب کو لانے
کے لئے مجھے تجویز کیا۔ میں نے پورے وثوق سے ان سے وعدہ کر لیا
کہ میں اصغر صاحب کو ضرور لا دوں گا۔ چنانچہ میں نے اصغر صاحب
کے یہاں جاکر مچھلی شہر کے مشاعرہ کی اطلاع دی اور شرکت کی
درخواست کی۔ راضی نہ ہوئے۔ میں نے باصرار درخواست کو
دُہرایا اور کہا کہ مچھلی شہر میں تو آپ کے والد صاحب مرحوم
قانون گو بھی رہ چکے ہیں اور آپ بھی وہاں بچپن میں
رہ چکے ہیں اس لئے مچھلی شہر کا خود بھی آپ پر
حق ہے مگر اصغر صاحب پھر بھی آمادہ نہ ہوئے مجبوراً میں تنہا
گیا۔ جب مشاعرہ میں شرکت کرکے واپس آیا۔ بزرگان وطن کے
سامنے شرمندگی کے باعث طبیعت بہت متاثر تھی اس لئے میں دوچار

دن اصغر صاحب کی خدمت میں حاضر نہیں ہوا۔ ایک دن جو وہاں گیا تو معلوم ہوا کہ اصغر صاحب مشاعرہ میں گورکھپور گئے ہیں۔ یہ سُن کر بہت رنج ہوا اور اصغر صاحب کے یہاں اپنی حاضر باشی ان کی خدمت میں رسائی اور گستاخی کا درجہ اس خبر کے آئینہ میں نظر آگیا۔ افسردہ دل واپس آیا اور حسب ذیل قطعہ ترتیب دے کر ایک لفافہ میں بند کیا اور اصغر صاحب کے گھر جا کر دے آیا کہ جب آئیں تو دے دیجئے:-

نہیں جاتے جو مجھلی شہر، گورکھپور کیوں جائیں
بجا کہتا ہوں یا بیجا وہ خود انصاف فرمائیں

وہی احباب کا جلسہ یہاں بھی تھا وہاں بھی تھا
وہی اشعار کا چرچا یہاں بھی تھا وہاں بھی تھا

مجھے کیا حق۔ جو مرضی میں کسی کے دخل دیتا ہوں
کسی کا شعر ہے میں کچھ تصرف کر کے لکھتا ہوں

"اُسی کی بات رد کر دیتے ہو جو دل سے ملتا ہے
مگر جو دل سے ملتا ہے بڑی مشکل سے ملتا ہے"

چار پانچ روز بعد جب پھر میں اصغر صاحب کے یہاں گیا تو اصغر صاحب آچکے تھے میں نے کنڈی کھٹکھٹائی وہ باہر آئے صاحب سلامت ہوئی دونوں بیٹھے۔ مزاج پرسی کے بعد اصغر صاحب نے جس انداز سے معذرت کی ہے اب میں کیا بتاؤں کہ میں خود کس قدر شرمندہ ہو رہا تھا کہ میں نے کیوں طنز کی تھی!

خوب کہا ہے جگر نے ؎

دل تڑپ کر دل نے تڑپایا سرِ محفل مجھے
اُن کو قاتل کہنے والے کہہ اٹھے قاتل مجھے

ایک بار مسز سروجنی نائیڈو الہ آباد میں سر سپرو کے یہاں آئی ہوئی تھیں۔ سر سپرو نے انکے اعزاز میں ایک مختصر طور مخصوص نشست اپنے گھر پر ترتیب دی جس میں اصغر صاحب بھی مدعو تھے۔ خود اصغر صاحب مجھ سے ناقل تھے کہ مسز نائیڈو چونکہ خود ادب کا بہت ستھرا ذوق اور انگریزی۔ اردو وغیرہ زبانوں میں بڑی قدرت رکھتی تھیں۔ اس لئے جب ان کو معلوم ہوا کہ یہاں ایک عمدہ شاعر موجود ہے تو انھوں نے نہایت اشتیاق سے مجھ سے غزل سُنانے کی فرمائش کی۔ میں نے اپنی یہ غزل سنائی

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا جو غم ہوا اُسے غمِ جاناں بنا دیا
میں کامیابِ دید بھی محرومِ دید بھی جلوؤں کے اژدحام نے حیراں بنا دیا
یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا
اے شیخ! وہ بسیط حقیقت ہے کفر کی کچھ قید و رسم نے جسے ایماں بنا دیا
کچھ آگ دی ہوس میں تو تعمیرِ عشق کی جب خاک کر دیا اُسے عرفاں بنا دیا
وہ شورشیں نظامِ جہاں جن کے دم سے ہے جب مختصر کیا انھیں انساں بنا دیا
ہم اس نگاہِ ناز کو سمجھے تھے نیشتر تم نے تو مسکرا کے رگِ جاں بنا دیا
بلبل بہ آہ و نالہ و گل مستِ رنگ و بو مجھ کو شہیدِ رنگِ گلستاں بنا دیا
عالم سے بے خبر بھی ہوں عالم میں بھی ہوں میں ساقی نے اس مقام کو آساں بنا دیا

کہتے تھے کہ جب میں نے یہ شعر پڑھا اے شیخ وہ بسیط الخ تو مسز نائیڈو سخت متحیّر ہو کر مجھے تکنے لگیں پھر کہنے لگیں جناب اسے پھر پڑھئے۔ میں نے دوبارہ پڑھا کہنے لگیں بہت ہی عجیب شعر ہے براہ کرم اسے پھر پڑھئے میں نے پھر دہرایا۔ میں ان کی ذہانت اور نکتہ سنجی پر حیرت کر رہا تھا کہ یوں تو انھوں نے دوسرے اشعار کی بھی تعریف کی اور خاص کر ان دو اشعار کو تو بہت پسند کیا۔ وہ شورشیں الخ اور ہم اس نگاہِ ناز کو الخ اور ان کی بہت داد دی مگر بقیہ اشعار پر داد دینے کا انداز کچھ اور تھا اور اس شعر کی تعریف کا انداز کچھ اور تھا۔ ان اشعار کی داد صاف معلوم ہو رہا تھا کہ، لطف اندوزی اور لذت یابی کے جذبے سے دے رہی تھیں مگر اس شعر کی تعریف کا جذبہ ہی دوسرا

تھا جسے میں "حیرت" سے تعبیر کرتا ہوں۔

ایک بار مولانا ابوالکلام آزاد الہ آباد تشریف لائے مجھے خبر ملی تو میں اصغر صاحب کے یہاں پہونچا اور اُن سے کہا "کچھ سنا آپ نے؟ وہ آئے ہوئے ہیں" "مدیر مسئول و محرر خصوصی، غریب الدیار عہد و ناآشنائے عصر، بیگانہ خویش، نمک پروردۂ ریش، معمورۂ تمنا و خرابۂ حسرت الخ" سُن کر بہت ہنسے کہنے لگے گیا آپ نے تذکرہ کی وہ فصل زبانی یاد کر لی ہے میں نے کہا جادو کی تعریف ہی یہ ہے کہ جو سر پہ چڑھ کے بولے۔ یہ انشا بھلا کسی کو فراموش ہو سکتی ہے؟ خیر تو اُن سے ملنے چلئے گا؟ کہنے لگے ہاں جی تو چاہتا ہے۔ تم تو شاید پہلے بھی اُن سے مل چکے ہو گے میں آج تک نہیں ملا ہیں نے ہاں میں دو بار مل چکا ہوں۔ اصغر صاحب کہنے لگے کہ "مگر میں اس شرط سے چلوں گا کہ اُن سے گفتگو تم ہی شروع کرنا۔ میں چاہتا ہوں کچھ دیر خاموش رہ کر ذرا پہلے مولانا کو خود پڑھ لوں۔ میں نے کہا اب سے پہلے تو جب میں اُن سے ملا ان کی شان میں فارسی اور عربی اشعار کہہ کر لے گیا تھا۔ آج میں اُن سے گفتگو کرنے کے لئے ایک خاص تقریر سوچ کر آیا ہوں۔"

غرض ہم دونوں آنند بھون پہونچے۔ میں نے ایک پرچہ پر اپنا نام لکھکر بھیجا کہ "سراج الحق معلم۔ گورنمنٹ کالج الہ آباد للہ و فی اللہ ملنا چاہتا ہے۔" یہ للہ فی اللہ کا فسوں بیکار نہیں گیا فوراً طلبی ہوئی۔ ہم لوگ ایک ہال میں جاکر بیٹھے کہ بغل کے دروازے سے مولانا آزاد غالباً سیاہ مخمل کی کشتی نما ٹوپی سر پر اور اپنی تیز خردبین آنکھوں پر عینک لگائے حسین داڑھی اور ہنس مکھ چہرے کے ساتھ نکلے اور سامنے کوچ پر آ کر بیٹھے۔ میں نے آگے بڑھ کر سلام اور مصافحہ کیا اس کے بعد اصغر صاحب نے بھی سلام و مصافحہ کیا۔ مولانا مجھ سے فرمانے لگے "آپ تو شاید پہلے بھی مجھ سے مل چکے ہیں۔" میں نے کہا جی ہاں۔ مولانا نے اپنے مخصوص لہجہ میں فرمایا۔ "مشاغل کی کثرت سے فرصت عنقا ہے مگر آپ کے للہ و فی اللہ کے نقط کی ہیبت سے میں نے ان مشاغل وقتیہ کو موخر کر دیا۔ فرمایئے کس غرض سے تشریف لانا ہوا۔"

مجھے تو اصغر صاحب کے حکم کی تعمیل میں مولانا کو باتوں میں کچھ الجھائے رکھنا تھا۔ میں نے کہا:

"جزاکم اللہ عنّی خیر الجزاء۔ یہ للہ فی اللہ کا لفظ پوچھئے تو بقول شخصے:۔

غرض یہ ہے کسی عنوان تجھے کریں مائل
کرشمہ سازئ ہر رند و پارسا معلوم" (اصغر)

بہر حال عرض کرنا یہ تھا کہ جناب نے الہلال اور البلاغ کا سلسلہ کیوں بند کر دیا۔ آپ کی سیاست نوازی سے جو نقصان اردو شعر و ادب کو پہونچا ہے میں قوم کی طرف سے بلکہ خود اردو کی طرف سے اس کی مؤدبانہ شکایت آپ کے گوش گزار کرنے آیا ہوں۔ آپ کے قلم نے بلا مبالغہ الہلال و البلاغ کے صفحات پر جو بیش بہا گوہر بے دریغ بکھیر دئے ہیں۔ آج ملک کے بہتر سے بہتر ادیب کا طرۂ فخر یہ ہے کہ ان موتیوں کو چُن کر اپنے اپنے طرز پر اپنی اپنی تقریر و تحریر کے تاگوں میں گوندھ لیں۔ الہلال و البلاغ کے انشاء بدیع بلکہ سحر حلال نے چند ہی برسوں میں اردو ادب کو اس درجہ مالا مال اور الفاظ۔ طرز ادا، حسن بیان کے نت نئے زیوروں سے اس طرح گرانبار کر دیا ہے کہ اردو اپنی رفتار سے چل کر شاید پچاس برس میں بھی اس درجۂ ترقی تک نہ پہونچ سکتی۔ آپ نے مذہب و سیاست دونوں کو ملک کے سامنے اس طرح پیش کیا کہ لوگ متحیر ہو کے رہ گئے۔ میرے خیال میں تو آپ شعر کے لئے بنے تھے اور شعر آپ کے لئے بنا تھا۔ یہ سیاست کے چکر میں آپ کہاں پڑ گئے یہ رائے تنہا میری ہی نہیں ہے خواجہ حافظ شیرازی بھی یہی فرماتے ہیں:۔

ترا ز کنگرۂ "شعر" می زنند صفیر
"ندانمت بہ سیاست" ترا چہ افتادہ است"

اتنا کہکر میں نے دم لیا تو مولانا مسکرائے۔ "الہلال" و "البلاغ" کا تذکرہ اور اس کے انشاء بدیع پر تبصرہ لقمۂ تر اور نوالۂ شیریں تھا۔ اس کا انکار تو نہ کر سکے البتہ سر ہلا کر اتنا فرمایا "جی نہیں۔ سیاست بھی ضروری ہے سیاست بھی ضروری ہے میرے بھائی!" اس کے بعد مجھ سے دریافت کیا کہ آپ نے (اصغر صاحب کیطرف اشارہ کر کے) ان صاحب کی تعریف نہیں کی۔ میں نے کہا میرے استاد۔ شاعر شیوا بیان، اردو کے حافظ شیرازی، حضرت اصغر گونڈوی۔ اور یہ شعر جو میں نے ابھی آپ کے سامنے پڑھا تھا "غرض یہ ہے کسی عنوان الخ" "یہ شعر آپ ہی کا ہے" مولانا کوچ پر کچھ کسمسائے اور پہلو بدلکر کہنے لگے "اچھا اس وقت مجھے معاف کیجئے۔ کام ضروری ہے ورنہ میں ابھی اور بیٹھتا۔ خدا نے چاہا تو پھر ملاقات ہوگی" ہم دونوں اٹھے اور رخصت ہو کر گھر واپس آئے۔ راستہ میں اصغر صاحب کہنے لگے کہ الہلال و البلاغ کا تذکرہ آپنے خوب چھیڑ دیا۔ پھر غالباً اسی ہفتہ مولانا نے اصغر صاحب کو ملاقات کیلئے پھر بلایا۔ اصغر صاحب تنہا تشریف لیگئے مجھے اطلاع نہیں دی۔ واپس آکر جب مجھ سے ملاقات کے واقعات بتانے لگے تو میں نے شکایت کی کہ آپ اکیلے اکیلے چلے گئے۔ کہنے لگے کہ انھوں نے جو وقت ملنے کا مقرر کیا تھا اسمیں اتنا موقع نہ مل سکا کہ تم کو اطلاع کرتا۔ واقعات یہ بتائے کہ اصغر کا کلام مولانا ابوالکلام صاحب نے خوب سنا۔ پھر کہنے لگے "کیا یہ ممکن ہے کہ آپ اپنے کلام کی نقل یا اگر نقل ممکن نہو تو انتخاب میرے پاس بھیجدیں" اصغر صاحب مجھ سے کہنے لگے "مولوی صاحب! میں ان سے اس کا وعدہ کر آیا ہوں اور آپ کے بھروسہ پر وعدہ کر آیا ہوں اس لئے نقل یا انتخاب آپ ہی کو کرنا ہے" میں نے کہا بسر و چشم۔ اس کے بعد اصغر صاحب کئی دن تک بازار میں عمدہ سے عمدہ نوٹ بک (بیاض) تلاش کرتے رہے۔ آخر ایک بہت ہی خوبصورت بیاض خرید لائے۔ میں نے نقل شروع کر دی۔ اول تو اصغر صاحب کے دونوں دیوان خود ہی منتخب اور مختصر ہیں پھر بھی یاد پڑتا ہے کہ بس دو ایک غزلیں اور بعض غزلوں میں سے ایک ایک دو دو اشعار حذف کر کے میں نے اس بیاض پر اصغر کا کلام سارا ہی نقل کر دیا تھا۔ یہ بیاض جب مولانا کے پاس پہونچی ہے تو انھوں نے وہ تبصرہ لکھا جو سرود زندگی کے شروع میں درج ہے۔ یہ تبصرہ اس وقت موصول ہوا جب اصغر کا دوسرا مجموعہ کلام موسومہ "سرود زندگی" ترتیب دیا جا چکا اور زیر طبع تھا۔ اسی زمانہ میں ان پر فالج کا پہلا حملہ ہوا اور وہ جانشین گنج میں مقیم تھے۔

اصغر صاحب دوسروں کے عمدہ لطیفوں سے بھی بہت لذت اندوز ہوتے تھے۔ الہ آباد میں ایک ذی علم کچھ عرصہ تک مقیم تھے وہ اپنے سائن بورڈ میں "علامہ ....." وغیرہ الفاظ لکھوائے ہوئے تھے اس لئے عام طور پر لوگ انھیں علامہ ہی کہتے تھے ان میں ایک کمزوری یہ بھی تھی کہ وہ اکثر اہل علم کی بابت یہ کہتے تھے کہ "ارے فلاں صاحب؟ وہ تو میرے والد کے شاگرد ہیں" یہ کہہ کر ایک خاص طرز سے ہنستے تھے، احباب اکثر علامہ صاحب کی اس بات کا بھی باہم لطف اندوزی کے لئے چرچا کرتے۔ ایک دن اصغر صاحب، جب ہندستانی اکاڈمی میں تھے۔ ایک بجے تک کام کر چکنے کے بعد ذرا تفریح کے لئے کرسی سے اٹھے اور شاہ محمد حسین کی کرسی کیطرف چلے جو اسی اکاڈمی میں اہلمد تھے اور ابتک ہیں شاہ صاحب کے پاس ہو کر اصغر صاحب نے جیب میں سے پانوں کی ڈبیا نکالی۔ ایک گلوری خود کھائی اور

ایک گلوری انکی طرف بڑھائی، شاہ صاحب نے گلوری لیتے ہوئے کہا "اصغر صاحب! خاقانی کا نام تو آپ نے سنا ہی ہوگا۔" انھوں نے کہا "ہاں سنا ہے" شاہ صاحب کہنے لگے "مگر یہ آپ کو شاید معلوم نہ ہوگا کہ "وہ تو میرے والد کے شاگرد ہیں"۔ یہ کہکر علامہ کی مخصوص طرز میں ہنسے یہ سننا تھا کہ اصغر صاحب ہنستے ہنستے بیتاب ہوگئے۔ پھر افاقہ ہوا پھر ہنسنے لگے کہ پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔

ایک مرتبہ میرے برادر بزرگ شاہ حسین محی الدین صاحب عباسی جو پہلے ہائی کورٹ میں مترجم تھے اب پنشن پاتے ہیں، اصغر صاحب کے یہاں گئے کچھ ذکر ان سے علامہ کے ہونے لگا عباسی صاحب نے کہا "ہاں میں بھی انھیں جانتا ہوں"۔ وہ سروس (Service) بہت زور کی کرلیتے ہیں لیکن ریٹرن (Return) نہیں کرسکتے "کسی کی تعلّیوں کی یہ تنبیہ (ٹینس اور بیڈمنٹن یا والی بال کے کھیلوں کی اصطلاح میں) ایک نہایت نادر اور اچھوتی تنبیہ تھی اصغر صاحب یہ سنکر بہت ہنسے اور اکثر اس تنبیہ کا ذکر کرتے۔

ایک دن خود اصغر صاحب انھیں علامہ سے گفتگو کررہے تھے۔ کسی شخص کے تذکرہ میں علامہ نے حسب عادت اس شخص کے بارہ میں بھی کہدیا کہ "ارے فلاں ؛ وہ تو میرے والد کے شاگرد ہیں ؛" تو اصغر صاحب نے نہایت سنجیدگی سے کہا "اب مجھے یہ معلوم کرنے کی فکر ہورہی ہے کہ آپ کے والد صاحب خود کس کے شاگرد تھے!"

میں نے ایک دن اصغر صاحب سے پوچھا کہ خیر ہم لوگ آپکی شاعری کے متعلق تو جو کچھ رائے رکھتے ہیں وہ تو رکھتے ہی ہیں یہ بتائیے کہ آپ کی شاعری کا خود آپ کی نظر میں کیا پایہ ہے اور ماضی یا حال کے اردو شعرا میں سے کس شاعر کا رنگ آپ کی شاعری میں ہے ؛ کہنے لگے "اگرچہ کسی شخص کا اپنے کسی وصف کے بارہ میں خود رائے زنی کرنا بظاہر ایک بیہودہ سا فعل ہے تاہم ایک لحاظ سے یہ ایک اچھا سوال ہے۔ میری نظر میں میری شاعری خواجہ میر درد۔ میرزا مظہر جانجاناں اور مرزا غالب کے رنگ شاعری کا ایک مجموعہ ہے"۔ افسوس ہے کہ اس خیال کی مزید تشریح خود انھیں سے سننے اور معلوم کرنے کا پھر موقع نہ مل سکا۔

میں نے اکثر تنہائی میں اصغر صاحب کے اس قول پر غور کیا۔ تو جو کچھ میں سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے۔ خواجہ میر درد اور مرزا مظہر دونوں کا کلام داخلی رنگ رکھتا ہے اور یہ دونوں ہی بزرگ واردات قلبی اور حالات باطنی شعر میں منتقل کرتے تھے۔ یہ لوگ قافیہ پیمائی نہیں کرتے تھے۔ شعر اس لئے نہیں کہتے تھے کہ شعر کہنے کی ضرورت ہے۔ یا مشاعرہ کیلئے غزل کہنی ضروری ہے یا حروف تہجا میں سے ہر ہر حرف کے قافیہ میں غزل کا ہونا ضروری ہے ورنہ دیوان ناقص رہ جائے گا یہ لوگ شعر اسوقت کہتے تھے جب سینے کی کسک سینہ کی فضا میں تنگی کرنے لگتی تھی۔ قلبی حالت دل کی وسعتوں کے باوجود گھٹن پیدا کرنے لگتی تھی۔ مگر پھر بھی ان دونوں بزرگوں میں ایک نازک فرق تھا۔ خواجہ میر درد قلبی حالت کو من وعن مگر سادہ انداز میں کہدینے پر اکتفا کرلیتے تھے۔ میرزا صاحب کی طرز ادا میں جدت ہوتی تھی۔ مگر یہ جدت آورد کی مرہون منت نہیں ہوتی تھی بلکہ آمد اور افتاد طبع کا لازمی نتیجہ ہوتی تھی جدت کے ساتھ مرزا صاحب کے کلام میں قدرتی زور بھی ہوتا تھا اور یہ دونوں باتیں یعنی مجردات کا ذکر کیفیات کا بیان۔ محسوسات کا اظہار اور ان میں واقعیت اور صداقت کی زیادہ سے زیادہ کوشش اصغر صاحب کے کلام میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

اس کے ساتھ اصغر کے یہاں کچھ فارسی کی تراکیب اور بندشیں بھی ہیں جو متاخرین شعرا میں مرزا غالب اور مومن کی نمایاں خصوصیت رہی ہیں اور اس پر غالباً اتفاق ہو چکا ہے کہ اگرچہ مومن خاں نے بھی جن کے تلامذہ میں اصغر مرحوم بھی تھے (مومن خاں کے شاگرد نسیم دہلوی۔ ان کے شاگرد منشی امیر اللہ تسلیم اور ان کے شاگرد اصغر مرحوم) اپنے کلام میں فارسی تراکیب لکھی ہیں اور ان میں جدتیں بھی پیدا کی ہیں مگر ان بندشوں میں بمقابلہ مرزا غالب صفائی و جلا۔ روانی اور حسن کی بہت کمی ہے یعنی مومن خاں کی بندشوں میں ایک گونہ ثقل۔ غرابت۔ تعقید باقی رہ گئی ہے۔ تو اصغر صاحب کے یہاں بندشوں میں مرزا غالب کی بندشوں کی طرح بہت برجستگی۔ بہت صفائی و صیقل بہت حسن و جمال پایا جاتا ہے۔

مثلاً گلستاں بنا دیا والی غزل ہی میں ایک مصرع کہا ہے ع
بلبل بہ آہ و نالہ، و گل مست رنگ و بو۔ یہ مصرع یوں بھی کہا جا سکتا تھا کہ

بلبل ہیں آہ و نالہ تو گل ہیں ہے رنگ و بو
تجھ کو شہید رسم گلستاں بنا دیا

مگر چونکہ یہ طرز بیان ادنیٰ توجہ سے پیدا ہو گیا اس لئے اصغر کی انفرادیت اس سے ابا کرتی تھی۔ انھوں نے یہ مصرع اتنا مضبوط۔ اس قدر باوزن اور متین کہا ہے کہ صاف مرزا غالب کے اس شعر کا جواب معلوم ہونے لگا کہ ؎

قمری کف خاکستر و بلبل قفس رنگ اے نالہ! نشان جگر سوختہ کیا ہے

اسی طرح اصغر صاحب کا ایک بے مثل شعر اور ہے جس میں فارسی کی نہایت خوبصورت ترکیب ہے :۔

دیدۂ بے خواب انجم سینۂ صد چاک گل
حسن بھی ہے مبتلائے درد پنہاں دیکھئے

پہلا مصرع معلوم ہوتا ہے ہیرے کے برابر سے ترشے ہوئے ٹکڑے ہیں جو فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن کے سانچہ میں نہایت خوبی سے جڑ دیئے گئے ہیں۔

ایک بار اپنا واقعہ سنانے لگے کہ میں نے منگلور میں قاضی سید عبدالغنی صاحب کاظمی منگلوری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ماہ رمضان گزارا۔ عید کے دن قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بعد نماز فجر میرے پاس کہلایا کہ بابو اصغر سے کہہ دو کہ عیدگاہ میرے ساتھ ہی چلیں گے۔ ان دنوں میں داڑھی منڈاتا تھا اسلئے میں نے صبح جلد جلد داڑھی مونڈوائی۔ غسل کیا کپڑے بدلے اور شیروانی پہن کر تیار ہو گیا کہ نہ معلوم قاضی صاحب کب طلب فرمائیں۔ تھوڑی دیر میں قاضی صاحب بھی کپڑے بدل کر باہر تشریف لائے۔ فٹن تیار رکھے جانے کا حکم دیا۔ فٹن آکر دروازہ پر رکی تو قاضی صاحب اس کے اندر بیٹھے میں ان کے بالکل سامنے کوچبان کی نشست کے نیچے چھوٹی نشست پر بیٹھ گیا۔ فٹن روانہ ہوئی۔ قاضی صاحب کی نظر دو ایک بار میرے چہرہ پر پڑی پھر ہٹ گئی ایک بار زیادہ جھک کر میرے چہرہ کو بغور دیکھا اور فرمایا "جا میرے یار! اتنی بھی تو نہیں!" اتنی کہتے ہوئے انگلیوں سے تھوڑی سی لمبائی کا اشارہ ظاہر کیا۔ مطلب یہ کہ داڑھی تمہارے چہرہ پر کم لمبی بھی تو نہیں۔ بس وہ دن اور آج کا دن کہ پھر میں نے داڑھی نہیں منڈائی۔ (اصغر صاحب خشخاشی داڑھی فرینچ کٹ رکھتے تھے)

یہاں تفصیل کا موقع نہیں اس لئے مذکورہ بالا چند واقعات کے ذکر پر اکتفا کی جاتی ہے ورنہ اصغر صاحب کی زندگی کے سیکڑوں گوشے ایسے ہیں جو ان کی انسان دوستی، سیر چشمی، مہمان نوازی، عالی ہمتی، وسیع المشربی اور خلوص و محبت کی تصویر ہمارے سامنے پیش کر سکتے ہیں